ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
Vol. 3, No.1 (2021)
(January to March)

تانیثیت اور شعری اَدب (آغاز تا دور جدید)

Faminism and poetry literature (modern from beginning to era)

ڈاکٹر عطاء الرحمن میو
ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

Abstract:

This tradition of Sadat Yar Khan Rangin was adopted by other poets as well and thus the promotion and development of Rekhti increased. The tradition of this tanithi accent gained momentum and colour in Lucknow until the male poets began to keep their own pleasures and began to feel proud to say poetry in this tone. This tone flourished in Nasar too. Wajid Ali Shah Akhtar, the last ruler of Lucknow, used to say poetry in a tanithi tone, even dressed like a woman, and he would sit among men, and he would take all the movements and actions that a woman passes through during delivery. Thus, understanding the pain of tanitism, they would interpret their emotions. Although some women were attracted to poetry and literature at the end of the eighteenth century, they did not reveal their names, so their efforts remained behind the scenes for a long time and for a long time they could not make their mark in the world of literature, to convince themselves. Our tanisi poetry also makes like a kunj, snapping, stammering, but who hears the sound of a parrot in the box? So, all the prosands of tanitism are left head-to-head with walls. To say that today there is a rule of social media everywhere that the under-album of your breath can be heard and seen in every corner of the known world but even today the media is occupied by specific adhaans. If they have their own interests, then sympathy is wrapped up by making lies true.

Key Words: tradition, Sadat Yar Khan Rangin, Rekhti, Lucknow, flourished, movements, attracted, stammering, media

تاریخ ادب اُردو کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تانیثی لہجے کا اُردو ہندی میں اظہار سب سے پہلے امیر خسرو نے کیا۔ امیر خسرو نے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ گیت، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، انملیاں، دوہے وغیرہ میں جہاں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی شعور کی بات کی وہاں عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کی۔ ان کا یہ گیت جو آج تک بڑے ذوق و شوق سے گایا اور سنا جاتا ہے:

چھاپ تلک سب چھینی رے موسے نیناں ملائیکے
بات گم کہہ دینی رے موسے نیناں ملائیکے

یہ گیت بذات خود اپنے اندر ایک تہذیب و ثقافت کی پہچان رکھتا ہے۔ قدیم اردو میں چھاپ عورتوں کے ہاتھ میں پہننے والے زیور کا نام تھا جسے انگوٹھی اور رِنگ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح نیناں بھی ہندی لفظ ہے۔ نیناں ملانا محاورہ ہے۔ آج اس کی بجائے آنکھ ملانا، آنکھ لڑنا، آنکھ لڑانا وغیرہ محاورے میں مستعمل ہیں۔ تانیثی لب و لہجے کی یہ روایت ریختی سے مستحکم ہوتی نظر آئی۔ ریختی سے مراد ایسی صنف سخن ہے جس میں عورتوں کے جذبات و خیالات کا اظہار عورتوں ہی کے زبان و محاورے میں کیا جائے۔ سعادت یار خاں رنگین اس کے موجد ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے لہجے میں شعر کہہ کر نسائی جذبات کی خوب ترجمانی کی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ میں تو ہر گز نہ زناخی سی کروں جان دریغ
اور وہ ترسائی مجھی ملنی کو ارمان دریغ (۱)

؎ جو ہونی تھی سو بات ہولی کہارو
چلو لیچلو میری ڈولی کہارو (۲)

؎ میں چاہ کی تجھکو مفت بدنام ہوئی
رنگین چل دور تجھکو قربان کروں (۳)

سعادت یار خاں رنگین کی یہ روایت دوسرے شعرا نے بھی اپنالی اور یوں ریختی کی ترویج وترقی میں اضافہ ہوا۔ اس تانیثی لب ولہجے کی روایت نے لکھنو میں خوب زور پکڑا اور رنگ جمایا یہاں تک کہ مرد شعرا اپنے تخلص بھی زنانہ رکھنے لگے اور اس لب ولہجے میں شعر کہنا باعثِ فخر سمجھنے لگے۔ نثر میں بھی یہ لہجہ خوب پھلا پھولا۔ لکھنو کے آخری حکمران واجد علی شاہ اختر تانیثی لب ولہجے میں شعر کہتے یہاں تک کہ عورتوں کی طرح لباس پہن کر مردوں میں بیٹھتے اور وہ ساری حرکات وسکنات اور کیفیات اپنے اوپر طاری کر لیتے تھے جن سے زچگی کے دوران ایک عورت گزرتی ہے۔ اس طرح تانیثیت کے درد کو سمجھ کر ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے۔ اگرچہ اٹھارویں صدی کے آخر میں کچھ عورتیں شعر وادب کی طرف راغب ہوگئی تھیں لیکن وہ اپنا نام ظاہر نہیں کرتی تھیں یوں ایک طویل عرصے تک ان کی کاوشیں پس پردہ ہی رہیں اور ایک عرصے تک دنیائے ادب میں وہ اپنی پہچان بنانے میں، اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ ان کے کارناموں کا ذکر تذکروں کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ گارسیں دتاسی کے خطبات میں سب سے پہلے خواتین کے شعری کارناموں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے مطابق:

> "سب سے پہلا تذکرہ جو خصوصاً شاعرات کے بارے میں لکھا گیا، وہ مولوی عبدالکریم کی تالیف (تذکرۃ النساء) ہے۔ گارسیں دتاسی نے اپنے خطبات میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ تذکرہ دلی میں چند سال قبل مرتب ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں کہ اختتام کو پہنچا یا نہیں۔"(۴)

زیب النسا مخفی دختر اورنگ زیب عالمگیر، میر تقی میرؔ کی صاحبزادی بیگم، بھی تانیثیت / نسائی شعری ادب میں اہم نام ہے۔ ان کے اشعار دیکھیے:

؎ برسوں خم، گیسو میں گرفتار تو رکھا　　اب کہتے ہو کیا تم نے ہمیں مار تو رکھا
؎ کچھ بے ادبی اور شب وصل نہیں کی　　ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا (۵)

خواتین کے تذکروں اور خطبات گارسیں دتاسی، تواریخ اردو ادب، ادبی گلدستوں کا مطالعہ کرنے سے اس بات کے پے در پے ثبوت مہیا ہوتے ہیں کہ تانیثیت / نسائی شعری ادب کا جو ڈول امیر خسرو نے ڈالا تھا، بتدریج نسائی شعری ادب کی روایات پروان چڑھتی رہیں، جس سے تانیثیت کے لب ولہجے کو استحکام ملا اور اردو ادب کے سرمائے میں زبان وبیان، محاورات، تراکیب ومرکبات اور نسائی اصطلاحات کا عمدہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ نجمہ رحمانی نے اپنے مقالہ "آزادی کے بعد اردو شاعرات" کے پہلے باب میں جینا بیگم، کاملہ بیگم جعفری، جمیعت نامی شاعرہ، اخترؔ اور دیگر کا ذکر اجمالی طور پر کیا ہے اور ان کے اشعار کے نمونے پیش کیے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی شاعرات عمدہ اور پختہ کلام کہنے میں ملکہ رکھتی تھیں۔

اخترؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

؎ لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا　　ان کا تھا کھیل خاک میں ہم کو ملا دیا (۶)

اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ چندا آماہ لقا تھیں۔ شفقت رضوی نے "دیوان مہ لقا بائی چندا" مرتب کیا اور مجلس ترقی ادب، لاہور نے شائع کیا ہے۔ جس میں 55 صفحات پر مبنی مقدمہ تحریر کیا ہے۔ کچھ اشعار دیکھیے:

؎ گل کے ہونے کی توقع پہ جیے بیٹھی ہے　　ہر کلی جان کو مٹھی میں لیے بیٹھی ہے (۷)
؎ ناز چندا کو نہ ہو کیوں نوجوانی پر فلک　　جس کو ہر دم ہے بھروسہ مرتضی سے پیر کا (۸)
؎ خون جگر یہ آنکھوں سے امڈا کہ بہہ چلا　　تس پر یہ جھڑی نہ تھمی اشکبار کی
؎ تیرے رخسار سے تشبیہہ اسے دوں کیونکر　　شمع تو چربی کو آنکھوں دیے بیٹھی ہے (۹)

مہ لقا بائی چندا نے بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ اپنی شاعری میں رمز وایمائیت، استعارات ومحاورات کا برمحل استعمال کیا ہے۔ جس سے زبان وبیان پر ان کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ انیسویں صدی کی شاعرات کے ہاں وہ تمام شعری لوازمات بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں، جو اس دور کے مرد شعرا نے

برتے ہیں۔ علمِ بیان، علم بدیع، سیاسی، سماجی و عصری شعور، زمانے کی سرد مہری، جنگ و جدل، شکست و ریخت، پیار محبت، ہجر و فراق، حمد و نعت ﷺ، منقبت، نسائی جذبات کا بے ساختہ اظہار سب کچھ موجود ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ کافر کیا مجھ کو بھی تری زلف نے کافر　　اس لام نے کھویا ترے اسلام ہمارا

؎ میں جانتی آنکھ لگی دل کو سکھ ہوا　　کم بخت کیسی آنکھ لگی دل کو دکھ ہوا

(۱۰)

درج بالا اشعار ایہام اور تجنیس تام کی عمدہ مثالیں ہیں۔ 1857ء کے انقلاب کے بعد جہاں معاشرہ نئی اقدار سے روشناس ہوا، پرانی اقدار دم توڑنے لگیں۔ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے ادارے بھی جابجا سر اٹھانے لگے۔ انجمن پنجاب کے قیام سے پہلے پنجاب میں سکشا سبھا کا قیام عمل میں آیا۔ جس کے روح رواں بابا کھیم سنگھ بیدی تھے جن کی کاوشوں سے نسائی تعلیم و تربیت کی داغ بیل پڑی۔ 1874ء میں انجمن پنجاب کے تحت نئی شاعری / نئی نظم کے مشاعروں کا انعقاد ہوا۔ مولانا الطاف حسین حالیؔ نے مناجات بیوہ، چپ کی داد، نشاط امید اور دیگر نظمیں لکھ کر نسائی ادب کی ترویج میں حصہ لیا۔ ان نظموں میں عورتوں کی بے بسی، بیوگی کے مسائل، معاشی پریشانیاں، زندگی کے لاینحل مسائل کو شعری زبان میں پیش کر کے تانیثیت کی نمائندگی کی۔ اکبر الہ آبادی، اقبال اور دیگر شعرا نے بھی اس کی تتبع کی۔ خواتین شاعرات نے بھی ادب برائے ادب کی قدیم روش کو ترک کر کے افادیت کی راہ اپنائی 11۔ ان شاعرات نے نظموں میں اپنے تخلیقی وفور اور عصری شعور کا بے دھڑک اظہار کیا۔ آزادی کے بعد زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، ادا جعفری، سیدہ اختر، آمنہ برجیس، رفیعہ بانو مضمرؔ، صفیہ شمیم، ممتاز مرزا اور دیگر شاعرات نے مختلف ادبی تحریکوں سے متاثر ہو کر نظمیں لکھیں۔ یہ نظمیں جنسی موضوعات کے حوالے ایک بے باکانہ جسارت کی غماز ہیں۔ فہمیدہ ریاض اپنے شعری مجموعے "بدن دریدہ" جسے مکتبہ دین و ادب، لکھنو نے 1978ء میں شائع کیا۔ اس میں پچاس کے قریب نظمیں ہیں۔ وہ پیش لفظ میں لکھتی ہیں:

> "ادیب شاعر فلسفی اور آرٹ بھی اسی معاشرے کی پیداوار ہیں۔ مگر ان کا زندگی گزارنے کا طریقہ ذرا مختلف ہوتا ہے۔ وہ ایک جوش و خروش سے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے کبھی احتجاج کا نعرہ نہ لگایا ہو، وہ کبھی نہیں جان سکتے کہ یہ کیسی جگر خراش صدا ہوتی ہے۔ کہ یہ نعرہ بلند کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ (۱۱)
>
> محسوس اور صدائے احتجاج کے لب تک آنے
>
> آدمی پر کیا گزر جاتی ہے۔ اس سے وہ کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔" (۱۲)

فہمیدہ ریاض کی نظمیں بھی اسی جگر خراش صدا کی بازگشت ہیں، وہ اپنی نظموں کے ذریعے سماج کے نام نہاد ٹھیکیداروں کو للکارتی ہیں، جھنجھوڑتی ہیں، جھنجھوڑتی ہیں، جنس کا بے باکانہ اظہار کرتی ہیں۔ اپنی کھوئی ہوئی تہذیب کا نوحہ کہتی ہیں، دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی ہیں۔ ان کی نظمیں کندن، اے والی و ربِ کون و مکاں، سورہ یاسین، بھیگی کالی رات کی بیٹی، باکرہ، لاؤ، ہاتھ اپنا لاؤ ذرا، آکاس بیل، لوری، کب تک، میں اس کے لہجے کی تلخی، کڑواہٹ، جیون رس، جذبات کی اتھل پتھل، عہد کا کرب اپنے خالق سے راز و نیاز غرض یہ کہ ایسی بے باکانہ لے ہے، جسے بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ نظموں کے اقتباس ملاحظہ ہوں:

تپا ہوا یہ چہرہ جیسے باد سموم سے جھلسا پھول
اور اس پر بھوری آنکھوں کے دیئوں کی لَو
دیکھنے والوں کے دلوں کو گرماتی ہے
بات بھی اس سے کرو تو جلتے دل کی آنچ سی آتی ہے
ہنسی میں چمک چمک اٹھے دل کا کندن
دنیا مٹانہ پائی دل کا بھولا پن
نہ کوئی یار میت نہ اس کا ساجن ہے
شہروں میں وہ رہے مگر بیراگن ہے

خوشی کے موتی پائے بھی تو کب ساتھ لئے
یونہی چلدی اپنے خالی ہاتھ لئے
جینے کا کچھ ڈھنگ نہ آیا خاک ہوئی
اپنی آگ میں جل کر پگلی راکھ ہوئی (۱۳)

(نظم کندن)

ڈوب گئی خاموشی میں مغرب کی اذاں
کیسا سکوت ہے، والی ورب کون ومکاں
الحمدللہ رب العالمین
سب تعریف خدا کی ہے جو ہے بہت عظیم (۱۴)

(نظم: اے والی رب کون ومکاں)

کب تک مجھ سے پیار کروگے
کب تک؟
جب تک میرے رحم سے بچے کی تخلیق کا خون بہے گا
جب تک میرا رنگ ہے تازہ
جب تک میرا انگ تنا ہے
پر اس سے آگے بھی تو کچھ ہے
وہ سب کیا ہے؟
کسے پتہ ہے؟
وہیں کی ایک مسافر میں بھی
انجانے کا شوق بڑا ہے
پر تم میرے ساتھ نہ ہوگے تب تک (۱۵)

(نظم: کب تک)

مذکورہ اقتباسات میں باد سموم، بھوری آنکھیں، دل کی آنچ، دل کا کندن، بھولا پن، بیراگن، خاک ہونا، راکھ ہونا، آگ میں جلنا، کون ومکاں، میت، ساجن، ڈوب جانا، رب العالمین کی حاکمیت پر پختہ ایمان، یہ سب اس بات کا ثبوت ہیں کہ کوئی کتنا ہی اسے باغی، بے باک، جنسی تلذذ اور تانیثیت کے جذبات کا بے خوف ترجمان قرار دے لیکن اس کے اندر سچائی کی رمق ہے، خالق کائنات پر جو ایمان ہے، وہ کسی طور بھی کم نہیں ہوتا، اسے آخرت پر یقین کامل ہے، دنیا کی بے ثباتی کا بھی شعور وادراک ہے۔ عورت کے تخلیقی عمل اور اس کی تکلیف سے آگہی ہے کیونکہ وہ خود ان سے مراحل سے گزری ہے۔ شکایت ہے تو یہ کہ عورت کی ناقدری، اسے کھلتی ہے جو اس کی برداشت سے باہر ہے، اسی بنا پر وہ معاشرے کے ایسے شر پسند اور دولت مند طبقے کو آئینہ دکھاتی ہے۔ جو ہماری تہذیب وثقافت کے دائرے میں شاید ناپسندیدہ ٹھہرتا ہے۔ حمایت علی شاعر اردو ادب میں تانیثیت / نسائی ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "اردو ادب میں تین خواتین ایسی ہیں جو اپنی انفرادیت کے سبب افسانہ، شاعری اور تنقید میں اولیت کا اعزاز رکھتی ہیں۔ عصمت چغتائی، ادا جعفری اور ممتاز شیریں۔ 1936ء کی ادبی تحریک نے جہاں مرد اہل قلم کو متاثر کیا اور فکر واسلوب کی نئی راہیں متعین کیں، وہاں خواتین کو بھی حیات وکائنات کے مسائل پر نئے زاویے سے سوچنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ پیرائیہ اظہار کی اس روش میں بھی تبدیلی آئی جو روایت کی اندھی پرستش سے عبارت

تھی۔ زندگی کی رواں دواں حقیقتوں پر نگاہ ڈالنے سے خود بینی و جہاں بینی کا ایک نیا انداز وجود میں آیا اور ادب و شعر کو وہ آگہی نصیب ہوئی جو اب سے پہلے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی۔"(۱۶)

ادا جعفری کی شاعری خصوصاً نظمیں شجر ممنوعہ کی بندشیں توڑ کر عرفان ذات اور شعور و آگہی کی شاعری ہے۔ ان میں غم و الم، انسانی بے بسی، زندگی کی خستہ سامانی، تیرگی ء قسمت، آب و گل، خون جگر، خون ارمان، آندھیوں، ظلمتوں کی موج در موج، پیچ در پیچ کہانیوں کی لے ہے۔ یہ ایسی سسکتی بلکتی لے ہے جس پر ارباب اختیار خندہ زن ہیں۔ وہ اس لے پر دیا کرنے کو تیار نہیں، وہ صرف اپنی عیش و طرب کی زندگی میں مگن ہیں۔ عوام کے حقوق سے، فلاح و بہبود سے صرف نظر کر کے اپنے حقوق منوانے کے لیے تحریک استحقاق پیش کر کے اپنی انا کی تسکین کرتے ہیں۔ خواہ ان کے رویوں کی وجہ سے کوئی خود سوزی کرے، خودکشی کرے، معصوم بچوں کو بازار میں برائے فروخت کا کتبہ لگا کر کھڑا کرے۔ مجبور و بے بس حوا کی بیٹیوں کی عصمت دری ہو۔ یہ محض اشک شوئی کے لیے ٹی وی کیمروں کے سامنے تصویریں بنواتے ہیں، پھر سے لہو و لعب میں ڈوب جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر وہ بندہ پوتر ہے، جو ان کے ابرو کے اشارے پر گنگا اشنان کر لے۔ غریب، مفلس، نادار، متوسط طبقہ ان کے لیے عضو معطل ہے اور معیشت پر بوجھ ہے۔ آج کے نسائی / تانیثیت کے لب و لہجے پر مبنی شاعری / نظموں میں مذکورہ حوالوں سے بڑھ کر ملکی و بین الاقوامی رویوں کی کھل کر نشاندہی کی گئی ہے۔ ادا جعفری کی شاعری بھی انھیں تلخ تجربات، حالات و واقعات کی عکاس ہے۔ ان کی نظم "میراث آدم" کی کچھ سطور ملاحظہ ہوں:

ہم اجالے کی بس اک کرن کے لیے
طوق و زنداں کی ایک اک کڑی جھیلتے
ایک دو دن نہیں سینکڑوں سال سے
زہر پیتے رہے، جاں گنواتے رہے
(لوگ آتے رہے لوگ جاتے رہے)
زیست سے مرگ تک، موت سے مہد تک
دشت سے دشت تک، عہد سے عہد تک
ہاتھ کٹتے رہے اور ننھا سا اک روشنی کا پیامی دیا
ہاتھ سے ہاتھ تک منتقل ہوتا جاتا رہا
جگمگاتا رہا　　(۱۷)

کچھ اور اشعار دیکھیے:

؎ اشعار میں ڈھلے ہیں کئی پارہ ہائے دل　　آنسو نہ تھے کہ ہم نے مروت میں پی لیے　　(۱۸)
؎ صدیوں سے مرے پاؤں تلے جنت انساں　　میں جنت انساں کا پتہ پوچھ رہی ہوں
؎ گفتار میں بے ساختہ پن اب بھی وہی ہے　　چپ ہیں کہ تب و تاب سخن اب بھی وہی ہے
؎ بدلے تو نہیں ہیں وہ دل و جاں کے قرینے　　آنکوں کی جلن، دل کی چبھن اب بھی وہی ہے　　(۱۹)
؎ بجھی ہوئی ہیں نگاہیں، غبار ہے کہ دھواں　　وہ راستہ ہے کہ اپنا بھی نقش پا نہ ملے
؎ تم اس دیار میں انساں کو ڈھونڈتی ہو جہاں　　وفا ملے تو بہ احساسِ مجرمانہ ملے　　(۲۰)

اُردو شاعرات میں مزمل بھٹی، غزالہ خاکوانی، بلقیس میانوالی، ثمینہ راجہ، حجاب عباسی، حمیرا راحت، ذکیہ غزل، راشدہ ماہین ملک، ریحانہ روحی، زاہدہ حنا، نجمہ شاہین کھوسہ، شبہ طراز، عارفہ شہزاد، نیل احمد اور دیگر شامل ہیں۔ جنھوں نے تانیثی شعری ادب میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ نجمہ شاہین کھوسہ بھی اکیسویں صدی کی نمائندہ شاعرہ ہیں جن کا پہلا شعری مجموعہ "پھول سے بچھڑی خوشبو"، دوسرا مجموعہ "میں آنکھیں بند رکھتی ہوں"، تیسرا مجموعہ "شام ٹھہر گئی"، چوتھا مجموعہ "پھول، خوشبو اور تازہ ہوا" ہے۔ کچھ نمونے کے اشعار دیکھیے:

ہر ایک خواب میں حرف و بیاں میں رہتا ہے　　وہ ایک شخص جو دل کے مکاں میں رہتا ہے

تم ستم گر ہو نہ گھبراؤ میری حالت پر　　زخم سہنے کا ابھی مجھ میں ہنر باقی ہے

آنے والے دور میں شاہین رہنا ہے مجھے　　سب کہیں گے یہ وہی اک دکھ بھری آواز ہے

نجمہ شاہین کے ہاں سادہ بیانی ہے۔ وہ بڑے سلیقے سے دل کی دنیا کی کیفیت بیان کر جاتی ہیں اور کسی کو کان و کان خبر بھی نہیں ہوتی۔ شاعری کا یہ وصف ہے کہ رمز و ایمائیت کے پیرائے میں آپ خوب دل کے پھپھولے پھوڑیں۔ شعر فہمی کا ادراک نہ رکھنے والے پر جوں تک نہیں رینگتی۔ میر تقی میرؔ نے کیا خوب کہا ہے:

اس میں راہ سخن نکلتی تھی　　شعر ہوتا تر اشعار اے کاش!

شش جہت اب تو تنگ ہیں ہم پر　　اس سے ہوتے نہ ہم دوچار اے کاش!

ہماری تانیثی شاعری بھی کونج کی طرح کرلاتی ہے، تڑپتی ہے، بلکتی ہے لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ سو، تانیثیت کی ساری پر سوز لے دیواروں سے سر ٹکڑا کر رہ جاتی ہے۔ کہنے کو تو آج ہر طرف سوشل میڈیا کی حکمرانی ہے کہ آپ کے سانسوں کا زیر و بم معلوم دنیا کے ہر کونے میں سنا اور دیکھا جا سکتا ہے لیکن آج بھی میڈیا پر مخصوص اذہان کا قبضہ ہے۔ ان کا اپنا مفاد شامل ہو تو جھوٹ کو سچ بنا کر ہمدردی سمیٹ لی جاتی ہے۔ اگر مفادات کا ٹکراؤ ہو تو سچ کو بھی جھوٹ کا لبادہ پہنا کر عقوبت خانے میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ یہی آج کے معاشرے کا آدھا سچ ہے۔ نجمہ شاہین جس معاشرے کی باسی ہے، وہ جبر کا، ظلم کا انا پرستی کا معاشرہ ہے۔ جہاں لڑکیوں کی تعلیم تو ایک طرف رہی لڑکوں کے لیے (ہاری، مزارعین، مفلس و نادار خاندان کے لیے خاص طور پر) بھی تعلیمی مدارس کا قیام بمشکل ہو پاتا ہے۔ اس لحاظ سے نجمہ شاہین کھوسہ کی ہمت قابل تحسین ہے کہ وہ نہ صرف ایک کامیاب کوالیفائیڈ ڈاکٹر کے روپ میں مخلوق خدا کے علاج معالجے کا سبب بن رہی ہے بلکہ ادب سے اس کا لگاؤ بھی قابل تعریف ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے شعری ادب سے اس کی کمٹمنٹ کا زندہ و جاوید ثبوت ہیں۔

رفیعہ شبنم کے اشعار بھی نسائی کرب کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی شاعری میں بھی تاریخی و تہذیبی جبر نمایاں ہے۔ یہ ایسا جبر ہے کہ رسم و رواج کے مخملی پردے میں سجا کر ان کی معصوم خواہشات کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور رونے بھی نہیں دیا جاتا۔ نسائی وجود اور کومل جذبوں کے قتل کی روایت نئی نہیں ہے یہ ریت صدیوں پرانی ہے۔ بیسویں صدی میں اس کے خلاف کچھ نسائی توانا آوازیں بلند ہوئیں، اب اکیسویں صدی میں یہ ایک باقاعدہ تحریک بن چکی ہے۔ شبنم کے ہاں بھی نسائی دکھ اور احتجاج کے مرقع رنگ ملتے ہیں۔

ہزار صدیوں سے دیوار و در میں قید ہوں میں　　ذرا سی دیر پروں کو مری اڑان تو دے

بغاوتوں کو کچلنا ہی فرض ٹھہرا تو　　امیر شہر مرے گھر سے ابتدا کرنا

مرضی سے اپنی بس یونہی دو سانس لے لیے　　تھوڑا سا حوصلہ تھا کوئی سرکشی نہ تھی　(۲۱)

عارفہ شہزاد کی شاعری گیان دھیان اور نروان کی شاعری ہے۔ اس کی نظمیں اپنی ذات کی پہچان رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں کھوج ہے، تجسس ہے، جستجو ہے، استفہام ہے، کل سے بچھڑنے کا رنج ہے، وہ ان نظموں کے پیرائے میں اپنی ذات کی متلاشی ہے۔ وہ پھر اسی پر سکون ماحول میں لوٹنے کی خواہاں ہے۔ جہاں سے ایک گندم نما پھل کی حرص نے انہیں عرش سے دھرتی پر لا پٹکا اور اسی جگہ پر واپسی کے لیے جو شرائط رکھی گئیں، حضرت انسان انہیں پوری کرنے کے بجائے رحمن کی بنائی ہوئی راہ سے بھٹک کر شیطانی راہوں پر چل نکلا۔ جس کی بدولت خود اس نے اپنی منزل کھوٹی کر لی۔ حالانکہ سورۃ فاتحہ، جو قرآن پاک کا دیباچہ بھی ہے، میں واضح کر دیا گیا ہے۔

ترجمہ: چلا ہم کو سیدھی راہ پر

راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا

نہ وہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے　(۲۲)

عارفہ شہزاد کی نظمیں "مقام حطیم"، "زیارت اقدس" میں سیدھی راہ اپنانے کا فلسفہ کار فرما ہے۔ وہ اپنی نظموں میں زندگیوں کو سدھارنے کی روش پر بھی گامزن ہیں۔ ان کی نظمیں وہاں میں نہیں تھی، تو پھر یوں ہوا کہ، دھکیلو مجھے، اجنبی، پروائی ہوں، پریت کی راس، male

sexting،escort، کھیل نہیں، رات چاہتی کیا ہے، سیلفی، زمیں آسماں سے ملتی نہیں، دائرے، ٹیوب روز، کسی سینے میں رکھا دل، گرہیں کھلتی نہیں، اذن گویائی، لفظ، لمس میں حنوط، وہ کیا مصلحت تھی، مقام حطیم، زیارت اقدس اور دیگر نظموں میں جہاں ایک طرف خالق کائنات کی کبریائی، جنت سے اماں حوا کے نکالے جانے کا نوحہ، زیارت اقدس ﷺ سے بصد نیاز عقیدت کا اظہار اور رب کی مخلوق کے لیے کلمہ سرشاری ہیں تو وہیں اپنی ذات کا کرب، معاشرتی، سماجی مسائل کا ادراک، نسائی / تانیثی رنج و محن، مشکلات، حوادث زمانہ، جبر واستبداد، تانیثیت کے مسائل کا بیان بھی ہے۔ ان کی نظم پروائی دیکھیے، کس خوبصورتی سے جنت سے نکلنے کی منظر کشی ہے۔

چکھ آئی ہوں ممنوعہ پھل
کون سا رب ہے جو دیکھے گا
طاق عدد میں طاق ملایا
جفت کا جوڑا آپ بنایا
کون اتارے گا جنت سے
رکھ آئی ہوں آپ زمیں پر
تن من اپنا
لباس بنا ہے میں نے
خود پہنوں گی
ایک ہدایت اتری بھی تو
کون سنے گا
صم "بکم" دیکھ رہے ہیں
آج فرشتے
لکھ آئی ہوں جو لکھنا تھا
کون سیاہی کو دیکھے اب
پھر دیکھیں گے
آگ جلائی ہے کس نے اور
کون جلے گا
کیا جانوں میں
دیکھو! کیسی سرشاری ہے؟
لمس میں کیسی نرماہٹ ہے
چھو کر دیکھو
پروائی ہوں۔ (۲۳)

اللہ سبحانہ تعالی نے انسان کی پیدائش کے بارے میں بار بار صراحت فرمادی ہے۔ خیر اور شر میں کیسے امتیاز کرنا ہے، اس کے لیے بھی ہمارے لیے ہدایت کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ صراط مستقیم کی راہ کس قدر اپناتے ہیں۔ جس کو اپنانے میں سراسر فلاح ہی فلاحے۔

ترجمہ:

"لوگو! ڈرتے رہو اپنے رب سے، جس نے بنایا تم کو ایک جان سے، اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا اور بکھیرے ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں۔" (۲۴)

عارفہ شہزاد آیت ربانی کے مفہوم کو یوں شعری دائرے میں سموتی ہیں:

طاق عدد میں طاق ملایا
جفت کا جوڑا آپ بنایا

ارشاد باری تعالی ہے: "کیا دیکھتا نہیں آدمی! کہ ہم نے اس کو بنایا ایک بوند سے، پھر تبھی وہ ہو گیا جھگڑتا بولتا، اور بٹھاتا ہے ہم پر کہاوت، اور بھول گیا اپنی پیدائش۔" (۲۵)

عارفہ شہزاد نے اس نظم میں قرآنی ترکیب "اساطیر الاولین" کو استفہامیہ لہجے میں بیان کیا ہے، کون جلے گا، کون دیکھے گا، کیسی نرماہٹ، کون سنے گا، کون اتارے گا، آگ جلائی کس نے، ایسے استفہام ہیں جنہیں ہر باشعور سمجھتا ہے۔ یہ استفہام تانیثیت کے لیے ہے اور مردوں کے لیے بھی۔ اب کون سیدھی راہ اپنا کر فلاح کی راہ چنتا ہے اور کون انحراف کر کے رب کی ناراضی مول لیتا ہے۔ یہ ہمارے اپنے کردار پر منحصر ہے۔ عارفہ شہزاد کی استفہامیہ لہجے کی حامل چند نظموں کے کچھ مصرعے بطور نمونہ ملاحظہ ہوں جہاں نسائی کرب پورے شدومد کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

"وہاں میں نہیں تھی"
فقط خالی پنجرہ بدن کا پڑا تھا
اور نیم وا ان کواڑوں کی ہر چرچراہٹ میں
حیرانیاں بولتی تھیں
زمیں کی فضا سے
مجھے کس نے باہر دھکیلا
فلک تک مری دسترس کیوں نہیں تھی
نہ جانے میں کب تک خلا میں بھٹکتی رہی تھی (۲۶)

نظم پریت کی راس میں وہ عورت کے ان جذبات و احساسات کی ترجمان ہیں جہاں وہ چاہتی ہے کہ اسے صرف جنسی تسکین کے لیے کھلونا سمجھنے کی بجائے اس کی ذات کے پوشیدہ پہلو جو ایک اندھیری غار کی طرح سمجھوتوں کی برف تلے دب چکے ہیں، انہیں کریدا جائے، انہیں تلاشا جائے جہاں اتنے بھید اور پرتیں ہیں کہ ہر پرت کی نیچے ایک نئی امنگ دفن ہے۔

"پریت کی راس"
دیکھ!
میں تیرے ہی جیسی ہوں
انگ سے انگ ملا کر دیکھ
پریت کی راس رچا کر دیکھ
جھوم، بدن کے ہنڈولے میں
چوم یہ پربت اپنے جیسے
چوٹی، چوٹی، برف کرید
اے ری! پالے اپنے بھید
چھو کے دیکھ اندھیر اغار
روشن کرنوں کی اک دھار
ہر اسمندر تیرے اندر

بھول بھی جا اب گوپی چندر۔۔۔۔!　　(۲۷)

اپنی نظم "زمیں آسماں سے ملتی ہے یا نہیں" میں زندگی کی ایک تلخ، مگر حقیقت پر مبنی تصویر دکھاتی ہیں جہاں صنف نازک کے نرم و گداز اور پر کیف جذبات مجروح کر کے کراہٹوں میں محلول کر دیے جاتے ہیں:

مدتوں سے اجنبی بوسوں میں
گھلتی حلاوت دھواں بن کر حلق میں پیوست ہونے لگتی ہے
گولڈ لیف کا ذائقہ چکھ لینے والی عورت
چاندی کے پنے سے کہاں بہلتی ہے　　(۲۸)

ایک دوسری جگہ "گرہیں کھلتی نہیں" میں جس طرح زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتی ہیں، وہ پڑھ کر قاری خود کو بھی ان گرہوں میں بے بسی سے الجھا ہوا، اس کی اذیت کو اپنے رگ و پے میں بخوبی محسوس کرتا نظر آتا ہے:

کیسی گرہوں میں تارِ نفس ہے یہ الجھا ہوا
ساری پیشانیوں پر لکیروں کا پھیلا ہوا جال ہے
اس میں جکڑی گئی
مسکراہٹ کہیں
دھجیاں چار اطراف اڑنے لگیں
کس کا ملبوس ہے؟
ہر نگر، ہر گلی
خوف ہی خوف ہے
اگلی باری ہے کس کی
کسی کو خبر تک نہیں
منہ چھپائے ہوئے
طعنے دشنام سہتے ہیں جو اجنبی
اپنے ہی تو نہیں؟
چار سو ہے، رگیں کاٹتی زمہریری ہوا
سرد مہری کے برفاب موسم میں
ٹھٹھرے ہوئے ہونٹ ہیں
اور زباں کی رگیں بھی تشنج سے کھنچنے لگیں
کیسا آسیب وحشت ہے
کیوں سر سے ٹلتا نہیں
آیتیں بھی ہمیں بھول جانے لگیں
جبریلِ امیں
سورۃ الناس اور الفلق پڑھ کے
اب تم ہی پھونکو
دلوں میں جو گرہیں پڑی ہیں

یہ ہم سے تو کھلتیں نہیں! (۲۹)

عارفہ شہزاد کا اپنے گھر میں بول چال کا جو بھی لب ولہجہ ہو لیکن ان کی تحریر، لفظوں کا موقع و محل کے مطابق برجستہ استعمال، تراکیب، مرکبات، محاورات، تشبیہ و استعارات اہل زبان کی چغلی کھاتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے اہل پنجاب کی اردو تحریر کی روانی دیکھ کر ہی پنجاب کو اردو زبان کا مولد و منشا قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے قدیم پنجاب میں لکھے جانے والے قصے کہانیوں اور نظموں کے مخطوطے، مسودات کی بنا پر یہ قرار دیا ہے کہ پنجاب میں اردو زبان کی نشوونما کے حوالے سے جو مآخذات اور خزینے نجی کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اگر ان کی صحیح معنوں میں چھان بین کی جائے اور حکومت اس کی سرپرستی کرے تو اردو کے آغاز و ارتقا کا نیا نظریہ سامنے آسکتا ہے۔ عارفہ شہزاد کی نظموں / شاعری میں جو رس ہے، مٹھاس ہے، علامتی نظام ہے، معاشرتی قدروں پر جو تحفظات ہیں۔ اگرچہ ان میں کٹیلا پن بھی موجود ہے۔ تلخی دوراں بھی ہے، تلخی جاناں بھی ہے، تلخی احباب بھی ہے، تلخی رہبراں بھی ہے۔ یہ ان کے اندر کی آواز ہے۔ ان کے سچے جذبات کی عکاسی ہے، جس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی۔ وگرنہ غالبؔ کی زبان میں:

؎ پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

بہرحال ان کی نظمیں "وہاں میں نہیں تھی"، "پریت کی راس"، "زمیں آسماں سے ملتی نہیں"، "گرہیں کھلتی نہیں"، "مقام حطیم"، "زیارت اقدس ﷺ"، "عمدہ نظمیں ہیں، جن میں زندگی سدھارنے کا سبق مضمر ہے۔

"تانیثیت: شعری ادب" اس قدر وسیع موضوع ہے کہ اس کے ذیلی عنوانات قائم کرکے سینکڑوں مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔ قدیم دور سے لے کر آج تک ہزاروں شاعرات نے اپنے اپنے سلیقے سے زندگی کے مختلف زاویوں پر اشعار کہے ہیں، وہ سب قابل قدر اور اردو شعری ادب کا سرمایہ ہیں، جس سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سعادت خاں یار رنگیں، دیوانِ رنگین (اصطلاحات بیگمات)، لکھنو، مطبع مسیحی، س۔ن، ص:۸
۲۔ ایضاً، ص:۱۲
۳۔ ایضاً، ص۲۰
۴۔ گارسیں دتاسی، خطبات گارسیں دتاسی، مرتب: انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، انجن ترقی اردو، ۱۹۳۵ء، ص:۱۰۹
۵۔ نجمہ رحمانی، آزادی کے بعد اردو شاعرات، دلی، مطبع بھارت آفیسٹ پریس، ۱۹۹۴ء، ص:۱۷
۶۔ ایضاً، ص:۲۰
۷۔ شفقت رضوی، مرتبہ: دیوان مہ لقابائی چندا، لاہور، مجلس ترقی ادب، ص:۱۵۲
۸۔ ایضاً، ص:۱۰۰
۹۔ ایضاً، ص:۱۵۲
۱۰۔ ایضاً، ص:۲۵
۱۱۔ ایضاً، ص:۳۱
۱۲۔ فہمیدہ ریاض، بدن دریدہ، لکھنو، مکتبہ دین وادب، ۱۹۷۸ء، ص:۱۲
۱۳۔ ایضاً، ص:۲۱
۱۴۔ ایضاً، ص:۲۵
۱۵۔ ایضاً، ص:۵۶
۱۶۔ حمایت علی شاعر، تعارف مشمولہ ساز سخن (انتخاب)، ادا جعفری، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، ۱۹۸۸ء، ص:۷
۱۷۔ ادا جعفری، ساز سخن (انتخاب)، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، ۱۹۸۸ء، ص:۴۶

۱۸۔ ایضاً، ص:۵۱

۱۹۔ ایضاً، ص:۸۵

۲۰۔ ایضاً، ص:۸۸

۲۱۔ کہکشاں ملک، نسائی شعری آفاق، پٹنہ، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، ۲۱۵ء، ص:۱۸۸

۲۲۔ القرآن، سورۃ فاتحہ، آیات:۵۔۷

۲۳۔ عارفہ شہزاد، عورت ہوں نا!، لاہور، دستاویز مطبوعات، ۲۰۱۶ء، ص:۲۷

۲۴۔ القرآن، سورۃ النسا، آیت:۱

۲۵۔ القرآن، سورۃ یسین، آیت:۷۷۔۷۸

۲۶۔ عارفہ شہزاد، عورت ہوں نا!، ص:۱۹

۲۷۔ ایضاً، ص:۲۸

۲۸۔ ایضاً، ص:۴۰

۲۹۔ ایضاً، ص:۵۰۔۵۱